

تفہیم القرآن

الْمَدَّثِرُ

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ المَدَّثِرُ کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی صحت نام ہے مضامین کا عنوان نہیں ہے۔

زمانہ نزول | اس کی پہلی سات آیات مکہ معظمہ کے باکل ابتدائی دور کی نازل شدہ ہیں بعض روایات جو بخاری، مسلم، ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت جابر بن عبد اللہ سے منقول ہیں ان میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ یہ قرآن مجید کی اولین آیات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں لیکن امت میں یہ بات قریب قریب بالاتفاق مسلم ہے کہ پہلی وحی جو حضور پر نازل ہوئی وہ اَقْرَبًا بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ سے مَآلَمَ يَعْلَمُ تک ہے۔ البتہ صحیح روایات سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اس پہلی وحی کے بعد کچھ مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، پھر اس وقفہ کے بعد جب از سر نو نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کا آغاز سورہ مدثر کی انہی آیات سے ہوا تھا۔ امام زہریؒ اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں

”ایک مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا اور اس زمانہ میں آپ پر اس قدر شدید غم کی کیفیت طاری رہی کہ بعض اوقات آپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ لیکن جب کبھی آپ کسی چوٹی کے کنارے پر بیٹھے جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر آپ سے کہتے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ اس سے آپ کے دل کو سکون حاصل ہو جاتا تھا اور وہ اضطراب کی کیفیت دور

ہوجاتی تھی۔ (ابن جریر)

اس کے بعد امام زہری خود حضرت جابر بن عبد اللہ ہی کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ
 ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فترۃ الوحی (وحی بند رہنے کے زمانے) کا ذکر کرتے ہوئے
 بیان فرمایا: ایک روز میں راستے سے گزر رہا تھا۔ یکایک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی،
 سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان اور زمین کے درمیان
 ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا اور گھر پہنچ کر میں نے
 کہا مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لمحات (ریاکمبل) اڑھا دیا۔ اُس
 وقت اللہ نے وحی نازل کی **يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ... پھر لکنا تم مجھ پر وحی کا نزول شروع**
ہو گیا۔ (بخاری - مسلم - مسند احمد - ابن جریر)

سورۃ کا باقی ماندہ حصہ آیت ۸ سے آخر تک اُس وقت نازل ہوا جب اسلام کی
 علانیہ تبلیغ شروع ہو جانے کے بعد مکہ میں پہلی مرتبہ حج کا موقع آیا۔ اس کا مفصل و آئینہ سیرت
 ابن ہشام میں بیان کیا گیا ہے جسے آگے چل کر ہم نقل کریں گے۔

موضوع اور مضمون | جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی جو بھی
 گئی تھی وہ سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی جس میں صرف یہ فرمایا گیا تھا کہ:

”پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، ایک کو تھڑے سے انسان کی تخلیق
 کی۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم
 دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔“

یہ نزول وحی کا پہلا تجربہ تھا جو اچانک حضور کو پیش آیا تھا۔ اس پیغام میں آپ کو یہ نہیں
 بتایا گیا تھا کہ آپ کس کا عظیم پر مامور ہوئے ہیں اور آگے کیا کچھ آپ کو کرنا ہے، بلکہ صرف
 ایک ابتدائی تعارف کر کے آپ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ آپ کی طبیعت پر جو
 شدید بار اس پہلے تجربے سے پڑا ہے اس کا اثر دُور ہو جائے اور آپ ذہنی طور پر اُندہ وحی

وصول کرنے اور نبوت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جاتیں۔ اس وقفہ کے بعد جب دوبارہ نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس سورہ کی ابتدائی سات آیتیں نازل کی گئیں اور ان میں پہلی مرتبہ آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ اٹھیں اور خلقِ خدا کو اس روش کے انجام سے ڈرائیں جس پر وہ چل رہی ہے، اور اس دنیا میں، جہاں دو مسروں کی بڑائی کے ڈنکے بچ رہے ہیں، خدا کی بڑائی کا اعلان کریں۔ اس کے ساتھ آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ اب جو کام آپ کو کرنا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی زندگی بہر لحاظ سے انتہائی پاکیزہ ہو اور آپ تمام ذیہوی فائدوں سے قطع نظر کر کے کامل اصلاح کے ساتھ خلقِ خدا کی اصلاح کا فریضہ انجام دیں۔ پھر آخری فقرے میں آپ کو تلقین کی گئی کہ اس فریضہ کی انجام دہی میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں ان پر آپ اپنے رب کی خاطر صبر کریں۔

اس فرمانِ الہی کی تعمیل میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی اور قرآن مجید کی پلے در پلے نازل ہونے والی سورتوں کو آپ نے سنانا شروع کیا تو مکہ میں کھلبلی مچ گئی اور مخالفوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ چند مہینے اس حال پر گزر رہے تھے کہ حج کا زمانہ آگیا اور مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قافلوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر آنے والے حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور حج کے اجتماعات میں جگہ جگہ کھڑے ہو کر قرآن جیسے نظیر اور موثر کلام سنانا شروع کر دیا، تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اس سے متاثر ہو جائے۔ اس لیے قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی جس میں طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی ان کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اس پر اتفاق ہو جانے کے بعد ولید بن مغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لیجیے جسے سب بالاتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کو کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا، نہیں، خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہیں، ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے، جیسی باتیں وہ گنگلاتے ہیں اور جس طرح کے قفرے وہ جوڑتے ہیں، قرآن کو ان سے کوئی دوسری نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بولے، انہیں مجنون کہا جاتے۔ ولید نے کہا وہ مجنون بھی نہیں ہیں۔ ہم نے دیوانے اور پاگل دیکھے ہیں۔ اس حالت میں آدمی جیسی بےکی بےکی باتیں اور اٹھی سیدھی حرکت کرتا ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ کون باور کرے گا کہ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ دیوانگی کی بڑ ہے یا مجنون کے دورے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے؛ لوگوں نے کہا اچھا تو پھر تم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا، وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ بولے، تو ان کو ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا وہ ساحر بھی نہیں ہیں۔ جادو گروں کو ہم جانتے ہیں اور اپنے جادو کے لیے جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی محمد پر چسپاں نہیں ہوتی پھر ولید نے کہا ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کرو گے لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم اس کلام میں بڑی صلاحیت ہے، اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی نرورار ہیں۔ اس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا تمہاری قوم تم سے راضی نہ ہوگی جب تک تم محمد کے بارے میں کوئی بات نہ کہو۔ اس نے کہا اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا قریب ترین بات جو کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادو گر ہے، یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو اُس کے باپ، بھائی، بیوی بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کر لیا پھر ایک منصبیہ کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حایوں کے درمیان پھیل گئے اور انہوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادو گر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے، اُس سے بڑھتی رہنا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خود ہی سارے عرب میں مشہور کر دیا (سیرۃ ابن ہشام، جلد اول، صفحہ ۲۸۸-۲۸۹)۔ اس قصے کا یہ حصہ کہ ابوجہل

کے اصرار پر ولید نے یہ بات کہی تھی عکبرہؓ کی روایت سے ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔
یہی واقعہ ہے جس پر اس سورہ کے دوسرے حصہ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اُس کے مضامین
کی ترتیب یہ ہے:

آیت ۸ سے ۱۰ تک منکرینِ حق کو خبردار کیا گیا ہے کہ آج جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا بُرا
انجام وہ قیامت کے روز دیکھ لیں گے۔

آیت ۱۱ سے ۲۶ تک ولید بن مُغیرہ کا نام لیے بغیر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس
شخص کو کیا کچھ نعمتیں دی تھیں اور ان کا جواب اس نے کیسی تھی دشمنی کے ساتھ دیا ہے۔ اس
سلسلے میں اُس کی ذہنی کشمکش کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ ایک طرف دِل میں وہ محمد
صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی صداقت کا قائل ہو چکا تھا، مگر دوسری طرف اپنی قوم میں اپنی
ریاست و وجاہت کو بھی خطرے میں نہ ڈالنا چاہتا تھا، اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ ایمان
لانے سے باز رہا، بلکہ کافی دیر تک اپنے ضمیر سے لڑنے جھگڑنے کے بعد آخر کار یہ بات بنا کر
لایا کہ تعلقِ خدا کو اس کلام پر ایمان لانے سے باز رکھنے کے لیے اسے جادو قرار دینا چاہیے۔
اُس کی اس صریح بد باطنی کو بے نقاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اپنے اس کروت کے بعد بھی
یہ شخص چاہتا ہے کہ اسے مزید انعامات سے نوازا جائے، حالانکہ اب یہ انعام کا نہیں بلکہ
دوزخ کا سردار ہو چکا ہے۔

اس کے بعد آیت ۲۷ سے ۸۴ تک دوزخ کی ہون کیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا
ہے کہ کس اخلاق اور کردار کے لوگ اس کے مستحق ہیں۔

پھر آیات ۸۵-۹۰ میں کفار کے مرض کی اصل بڑبڑادی گئی ہے کہ وہ چونکہ آخرت سے
بے خوف ہیں اور اسی دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اس لیے وہ قرآن سے اس طرح جھگڑتے
ہیں جیسے شیر سے ڈر کر جنگلی گدھے بھاگے جا رہے ہوں، اور ایمان لانے کے لیے طرح طرح کی
غیر معقول شرطیں پیش کرتے ہیں، حالانکہ خواہ ان کی کوئی شرط بھی پوری کر دی جائے، اظہارِ

کے ساتھ وہ ایمان کی راہ پر ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتے۔

آخر میں صاف صاف فرمادیا گیا ہے کہ خدا کو کسی کے ایمان کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی ہے کہ وہ اس کی شرطیں پوری کرنا پھرے۔ قرآن ایک عام نصیحت ہے جو سب کے سامنے پیش کر دی گئی ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس کو قبول کر لے۔ خدا اس کا مستحق ہے کہ لوگ اُس کی نافرمانی سے ڈریں، اور اسی کی یہ نشان ہے کہ جو شخص بھی تقویٰ اور خدا ترسی کا رویہ اختیار کرے اسے وہ معاف کر دیتا ہے خواہ وہ پہلے کتنی ہی نافرمانیاں کر چکا ہو۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

آسے اور پھیلے کر لینے والے، اٹھو اور خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔

لہذا پوری بات میں ہم ان آیات کے نزول کا جو پس منظر بیان کر آئے ہیں اس پر غور کرنے سے یہ بات ابھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا ایہا الرسول یا ایہا النبی کہہ کر مخاطب کرنے کے بجائے یا ایہا المدثر کہہ کر کیوں مخاطب کیا گیا ہے۔ چونکہ حضور بیکجا جبریل علیہ السلام کو آسمان زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھے دیکھ کر سمیت زدہ ہو گئے تھے اور اسی حالت میں گھبرای کر آپ نے اپنے اہل خانہ سے فرمایا تھا کہ مجھے اٹھاؤ، مجھے اٹھاؤ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو یا ایہا المدثر کہہ کر خطاب فرمایا۔ اس لطیف طرز خطاب سے خود بخود مدنیہ مفہوم نکلتا ہے کہ آسے میرے پیارے بندے، تم اور پھیلے کر لینے کہاں گئے، تم پر تو ایک کارِ عظیم کا بار ڈالا گیا ہے جسے انجام دینے کے لیے تمہیں پورے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

یہ اسی نوعیت کا حکم ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو نبوت کے منصب پر مامور کرتے ہوئے دیا گیا تھا کہ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيمٌ۔ اپنی قوم کے لوگوں کو ڈرو تو قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے۔ (نوح، ۱)۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آسے اور پھیلے کر لینے والے، اٹھو اور تمہارے گرد و پیش خدا کے جو بندے خواہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اُن کو جو نکادو۔

اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔ اور گندگی سے دُور رہو۔ اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے
اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔

انہیں اُس انجام سے ڈراؤ جس سے یقیناً وہ دوچار ہونگے اگر اسی حالت میں مبتلا رہے۔ انہیں خبردار کر دو کہ
وہ کسی اندھیرنگری میں نہیں رہتے ہیں جس میں وہ اپنی مرضی سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں اور ان کے کسی عمل کی
کوئی بازپرسی نہ ہو۔

۳۔ یہ ایک نبی کا اولین کام ہے جسے اس دنیا میں اُسے انجام دینا ہوتا ہے۔ اُس کا پہلا کام ہی یہ ہے
کہ جاہل انسان یہاں جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں اُن سب کی نفی کر دے اور ہلکے پکارے دنیا بھر میں یہ اعلان
کر دے کہ اس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا اور کسی کی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمہ اللہ اکبر
کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اذان کی ابتدا ہی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے نماز میں بھی
مسلمان کبیر کے الفاظ کہہ کر داخل ہوتا ہے اور بار بار اللہ اکبر کہہ کر اٹھتا اور بیٹھتا ہے۔ جانور کے گلے پر
چھری بھی پھیرتا ہے تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر پھیرتا ہے۔ نعرۂ تکبیر کج ساری دنیا میں مسلمان کا سب سے زیادہ
نمایاں امتیازی شعار ہے کیونکہ اس امت کے نبی نے اپنا کام ہی اللہ کی تکبیر سے شروع کیا تھا۔

اس مقام پر ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ ان آیات کی شانِ نزول
سے معلوم ہو چکا ہے، یہ پہلا موقع تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کا عظیم الشان فرضیہ انجام
دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور تب اظہار تھی کہ جس شہر اور معاشرے میں یہ مشن لے کر اٹھنے
کا آپ کو حکم دیا جا رہا تھا وہ شرک کا گڑھ تھا۔ بات صرف اتنی ہی نہ تھی کہ وہاں کے لوگ عام عربوں کی طرح
شرک تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ مکہ معظمہ مشرکین عرب کا سب سے بڑا تیرتھ بنا ہوا تھا اور
قریش کے لوگ اُس کے مجاور تھے۔ ایسی جگہ کسی شخص کا تن تنہا اٹھنا اور شرک کے مقابلے میں توحید کا علم بلند
کر دینا بڑے جان جو کھوں کا کام تھا۔ اسی لیے اٹھو اور خبردار کرو کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ اپنے رب کی
بڑائی کا اعلان کرو اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھنا ہے کہ جو بڑی بڑی ہولناک طاقتیں اس کام میں تمہیں فرام
نظر آتی ہیں ان کی ذرا پروا نہ کرو اور صفات صاف کہہ دو کہ میرا رب اُن سب سے زیادہ بڑا ہے جو میری

اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بڑی سے بڑی ہمت افزائی ہے جو اللہ کا کام شروع کرنے والے کسی شخص کی کی جاسکتی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا نقش جس آدمی کے دل پر گہرا جما ہوا ہو وہ اللہ کی خاطر اکیلا ساری دنیا سے لڑ جانے میں بھی ذرہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے گا۔

بلکہ یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔

ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ معدے گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ ﷺ علیہ وسلم جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر آئے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نفاقت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا، اور حضورؐ کا کام ان لوگوں کو سرسراخا سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اس لیے آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہی اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضورؐ نے نوع انسانی کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانہ جاہلیت کے اہل عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتیٰ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو طہارت کا ہم معنی ہو۔ بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیلی جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مفہوم ان الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچھلا ہوتا ہے، زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اچھے کپڑے ہی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیا دار انسان ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت میل کچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی حس بھی جس شخص کے اندر موجود ہو وہ صاف ستھرا انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے رستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اس کی ظاہری حالت بھی ایسی پاکیزہ اور نپیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی

شخصیت میں کوئی ایسی کثافت نہ پائی جائے جو طابع کو اس سے متنفر کرنے والی ہو۔

تیسرا مفہم اس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اخلاقی صیوب سے پاک رکھو تمہارا لباس مسخرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو، مگر اس میں مخرو غرور، ریاد اور زناقت، ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ لباس وہ اولین چیز ہے جو آدمی کی شخصیت کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے جس قسم کا لباس کوئی شخص پہنتا ہے اس کو دیکھ کر لوگ پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ رئیسوں اور نوابوں کے لباس، مذہبی پیشہ وروں کے لباس، جسکتیہ اور بر خود غلط لوگوں کے لباس پچھورے اور کم ظرف لوگوں کے لباس، بدخواہ اور آوارہ غش لوگوں کے لباس، سب اپنے پہننے والوں کے مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کا مزاج ایسے سب لوگوں سے فطرۃً مختلف ہوتا ہے، اس لیے اس کا لباس بھی ان سب سے لازماً مختلف ہونا چاہیے۔ اس کو ایسا لباس پہننا چاہیے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کر لے کہ وہ ایک شریف اور شائستہ انسان ہے جو نفس کی کسی بُرائی میں مبتلا نہیں ہے۔

چوتھا مفہم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامن کی ہم معنی الفاظ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابن عباس، ابراہیم حنفی، شافعی، عطاء، مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر، حسن بصری اور دوسرے اکابر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں کہ فلان طاہر الثیاب و فلان طاہر الذیل بد فلان شخص کے کپڑے پاک ہیں یا اس کا دامن پاک ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق اچھے ہیں۔ اس کے برعکس کہتے ہیں فلان دنس الثیاب، اس شخص کے کپڑے گندے ہیں اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بد معاملہ آدمی ہے، اس کے قول قرار کا کوئی اعتبار نہیں۔

۵۔ گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے خواہ وہ عقائد اور خیالات کی ہو، یا اخلاق و اعمال کی، یا جسم و لباس اور رہن سہن کی مطلب یہ ہے کہ تمہارے گرد و پیش سارے معاشرے میں طرح طرح کی جو گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب سے اپنا دامن بچا کر رکھو۔ کوئی شخص کبھی تم پر یہ حجت نہ رکھ سکے کہ جن برائیوں سے

تم لوگوں کو روک رہے ہو ان میں سے کسی کا بھی کوئی شائبہ تمہاری اپنی زندگی میں پایا جاتا ہے۔

یہ اصل الفاظ ہیں وَلَا تَمَنَّوْا تَسْتَكْتَبُوْا۔ ان کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں ان کا ترجمہ کر کے پورا مطلب ادا نہیں کیا جاسکتا۔

ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جس پر بھی احسان کرو بے غرضانہ کرو۔ تمہاری عطا اور بخشش اور سخاوت اور حُسنِ سلوک محض اللہ کے لیے ہو، اس میں کوئی شائبہ اس خواہش کا نہ ہو کہ احسان کے بدلے میں تمہیں کسی قسم کے دینی فوائد حاصل ہوں۔ بالفاظِ دیگر اللہ کے لیے احسان کرو، فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوئی احسان کرو۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نبوت کا جو کام تم کر رہے ہو یہ اگرچہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ تمہاری بدولت خلقِ خدا کو ہدایت نصیب ہو رہی ہے، مگر اس کا کوئی احسان لوگوں پر نہ تھا جو اور اس کا کوئی فائدہ اپنی ذات کے لیے حاصل نہ کرو۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ تم اگرچہ ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہو، مگر اپنی نگاہ میں اپنے عمل کو کبھی بڑا عمل نہ سمجھو اور کبھی یہ خیال تمہارے دل میں نہ آئے کہ نبوت کا یہ فریضہ انجام دے کر، اور اس کام میں جان لڑا کر تم اپنے رب پر کوئی احسان کر رہے ہو۔

یہ یعنی یہ کام جو تمہارے پیروں کی جا رہا ہے، بڑے جان جو کھوں کا کام ہے۔ اس میں سخت مصائب اور مشکلات اور تکلیفیں سے تمہیں ساتھ پیش آئے گا۔ تمہاری اپنی قوم تمہاری دشمن ہو جائے گی۔ سارا عرب تمہارے خلاف صفت آرا ہو جائے گا۔ مگر جو کچھ بھی اس راہ میں پیش آئے، اپنے رب کی خاطر اس پر صبر کرنا اور اپنے فرض کو پوری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دینا۔ اس سے باز رکھنے کے لیے خوف، طمع، لالچ، دوستی، دشمنی، محبت ہر چیز تمہارے رستے میں حائل ہوگی۔ ان سب کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہنا۔

یہ تھیں وہ اولین ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اُس وقت دی تھیں جب اُس نے آپ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپ اٹھ کر نبوت کے کام کا آغاز فرمادیں۔ کوئی شخص اگر ان چھوٹے چھوٹے فقروں پر اور ان کے صفائی پر غور کرے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ ایک نبی کو نبوت کا کام شروع کرتے وقت اس سے

اچھا، جب صورتوں میں پھونک ماری جائے گی، وہ دن بڑا ہی سخت دن ہوگا، کافروں کے لیے ہلکانہ ہوگا۔ چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا، بہت سا مال اس کو دیا، اس کے بہتر کوئی ہدایات نہیں دی جاسکتی تھیں۔ ان میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ آپ کو کام کیا کرنا ہے، اور یہ بھی بھجوا دیا گیا کہ اس کام کے لیے آپ کی زندگی اور آپ کے اسحاق اور معاملات کیسے ہونے چاہئیں، اور یہ تعلیم بھی دے دی گئی کہ یہ کام آپ کس نیت، کس ذہنیت اور کس طرز فکر کے ساتھ انجام دیں، اور اس بات سے بھی خبردار کر دیا گیا کہ اس کام میں آپ کو کن حالات سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان کا مقابلہ آپ کو کس طرح کرنا ہوگا۔ آج جو لوگ تعصب میں اندھے ہو کر یہ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ صرغ کے دوروں میں یہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہو جایا کرتا تھا وہ ذرا آنکھیں کھول کر ان فقروں کو دیکھیں اور خود سوچیں کہ یہ صرغ کے کسی دورے میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں یا ایک خدا کی ہدایات ہیں جو رسالت کے کام پر مامور کرتے ہوئے وہ اپنے بندے کو دے رہا ہے؟

شہ جیسا کہ ہم دیکھا ہے میں بیان کرتے ہیں، اس سورہ کا یہ حصہ ابتدائی آیات کے چند جینے بعد اُس وقت نازل ہوا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملامت تبلیغ اسلام شروع ہو جانے کے بعد پہلی مرتبہ حج کا زمانہ آیا اور سردارانِ قریش نے ایک کانفرنس کر کے یہ طے کیا کہ مکہ میں باہر سے آنے والے حاجیوں کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کے لیے پروپیگنڈا کی ایک زبردست مہم چلائی جائے۔ ان آیات میں کفار کی اسی کارروائی پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس تبصرے کا آغاز ان الفاظ سے کیا گیا ہے جن کا مطلب یہ ہے کہ اچھا، یہ حرکتیں جو تم کرنا چاہتے ہو کر لو، دنیا میں ان سے کوئی مقصد برابری تم نے کر بھی لی تو اُس روز اپنے بُرے انجام سے کیسے بچ نکلو گے جب صورتوں میں پھونک ماری جائے گی اور قیامت برپا ہوگی۔ دور کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد اول، الانعام، حاشیہ ۶۷، جلد دوم، ابراہیم، حاشیہ ۵۷، جلد سوم، طہ، حاشیہ ۷۸، الحج، حاشیہ ۱، جلد چہارم، یس، حاشیہ ۲۶، ۲۷، ۲۸، الزمر، حاشیہ ۷۹، جلد پنجم، ق، حاشیہ ۵۲، ۵۳۔

۱۷۔ اس ارشاد سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ دن ایمان لانے والوں کے لیے ہلکا ہوگا اور اس کی سختی صرف حق کا انکار کرنے والوں کے لیے مخصوص ہوگی۔ مزید براں یہ ارشاد اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے

ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیئے، اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی، پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔^{۱۱} برگز نہیں، وہ ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے۔ میں تو اسے کہ اُس دن کی سختی کافروں کے لیے مستقل سختی ہوگی، وہ ایسی سختی نہ ہوگی جس کے بعد کبھی اس کے نرمی سے بدل جانے کی امید کی جاسکتی ہو۔

۱۱۔ یہ خطاب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی، کفار کی اس کافر نفس میں جس شخص (ولید بن مغیرہ) نے تمہیں بدنام کرنے کے لیے یہ مشورہ دیا ہے کہ تمام عرب سے آنے والے حاجیوں میں تمہیں جاوگر مشہور کیا جائے، اُس کا معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اُس سے کٹنا اب میرا کام ہے، تمہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۲۔ اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ جب میں نے اُسے پیدا کیا تھا اُس وقت یہ کوئی مال اور اولاد اور وجاہت اور ریاست لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ دوسرا یہ کہ اُس کا پیدا کرنے والا اکیلا میں ہی تھا، وہ دوسرے معبود، جن کی خدائی قائم رکھنے کے لیے یہ تمہاری دعوتِ توحید کی مخالفت میں اس قدر سرگرم ہے، اُس کو پیدا کرنے میں میرے ساتھ شریک نہ تھے۔

۱۳۔ ولید بن مغیرہ کے دس بارہ لڑکے تھے جن میں سے حضرت خالد بن ولید تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان بیٹوں کے لیے شھود کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو کہیں اپنی روزی کے لیے ڈور دھوپ اور سفر کرنے کی حاجت پیش نہیں آتی، ان کے گھر کھانے کو اتنا موچ ہے کہ ہر وقت باپ کے پاس موجود اور اس کی مدد کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کے سب بیٹے نامور اور با اثر ہیں، مجلسوں اور محفلوں میں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ اس مرتبے کے لوگ ہیں کہ معاملات میں ان کی شہادت قبول کی جاتی ہے۔

۱۴۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس پر بھی اس کی حرص ختم نہیں ہوئی اتنا کچھ پانے کے بعد بھی وہ بس اسی فکر میں لگا ہوا ہے کہ اسے دنیا بھر کی نعمتیں عطا کر دی جائیں۔ دوسرا مطلب حضرت حسن بھری اور بعض دوسرے بزرگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر واقعی مجھ کا یہ بیان سچا ہے کہ مرنے کے

عنتقریب ایک کٹھن چڑھاتی چڑھاؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی تو ضد لگی ہاں اس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں، خدا کی مار اس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی پھر دو گول کی طرف دیکھا۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا پھر ٹٹیا اور بکتر میں لڑ گیا۔ آخر کار بول لاکہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جاؤ جو پہلے سے چلا آ رہا ہے، یہ تو ایک انسانی کلام ہے۔ عنتقریب میں اسے دوزخ میں جھونک دوں گا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دوزخ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے کھال جھلس دینے والی آئیں کارکن اس پر مقرر ہیں۔ ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے

بعد کوئی دوسری زندگی ہے اور اس میں کوئی جنت بھی ہوگی تو وہ جنت میرے ہی لیے بنائی گئی ہے۔

۱۱۔ یہ اس واقعہ کا ذکر ہے جو کفار مکہ کی مذکورہ بالا کانفرنس میں پیش آیا تھا۔ اس کی جو تفصیلات ہم دیا ہے میں نقل کر چکے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ شخص دل میں قرآن کے کلام الہی ہونے کا قائل ہو چکا تھا لیکن اپنی قوم میں محض اپنی وجاہت و ریاست برقرار رکھنے کے لیے ایمان لانے پر تیار نہ تھا۔ جب کفار کی اس کانفرنس میں پہلے اس نے خود ان تمام الزامات کو روک دیا جو قریش کے سرشار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگا رہے تھے تو اسے مجبور کیا گیا کہ وہ خود کوئی ایسا الزام تراشے جسے عرب کے لوگوں میں پھیلانے کا حضور کو بدنام کیا جاسکتا ہو۔ اس موقع پر جس طرح وہ اپنے ضمیر سے لڑا ہے اور جس شدید ذہنی کشش میں کافی دیر متبادرہ کر آخر کار اس نے ایک الزام گھڑا ہے اس کی پوری تصویریں کھینچ دی گئی ہیں۔ ۱۱۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو شخص بھی اس میں ڈالا جائے گا اسے وہ ہلاک خراب کر دے گی مگر مرکز بھی اس کا بیچھا نہ چھوڑے گا بلکہ وہ پھر زندہ کیا جائے گا اور پھر جلایا جائے گا۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰی، وہ نہ اس میں مرے گا نہ جیے گا (الاعلیٰ-۱۳)۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عذاب کے مستحقین میں سے کسی کو باقی نہ رہنے دیگی جو اس کی گرفت میں آئے بغیر رہ جائے، اور جو بھی اس کی گرفت میں آئے گا اسے عذاب دینے بغیر نہ چھوڑے گی۔

۱۲۔ یہ کہنے کے بعد کہ وہ جنم میں سے کچھ جلاتے بغیر نہ چھوڑے گی، کھال جھلس دینے کا الگ ذکر کرنا

بنائے ہیں، اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے قتنہ بنا دیا ہے، تاکہ اہل کتاب کو یقین آجائے
 بظاہر کچھ غیر ضروری سامعوس ہوتا ہے۔ لیکن عذاب کی اس شکل کو خاص طور پر الگ اس لیے بیان کیا گیا ہے
 کہ آدمی کی شخصیت کو نمایاں کرنے والی چیز دراصل اس کے چہرے اور جسم کی کھال ہی ہوتی ہے جس کی بدنامی
 اُسے سب سے زیادہ کھلتی ہے۔ اندرونی اعضا میں خواہ اسے کتنی ہی تکلیف ہو، وہ اس پر اتنا زیادہ سنجیدہ
 نہیں ہوتا جتنا اس بات پر سنجیدہ ہوتا ہے کہ اس کا منہ بدناما ہو جائے، یا اس کے جسم کے کھلے حصوں کی
 جلد پر ایسے داغ پڑ جائیں جنہیں دیکھ کر ہر شخص اُس سے گھن کھانے لگے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ یہ حسین چہرے
 اور بڑے بڑے شاندار جسم لیے ہوتے جو لوگ آج دنیا میں اپنی شخصیت پر چھو لے پھر رہے ہیں، یہ اگر اللہ
 کی آیات کے ساتھ عناد کی وہ روش برتیں گے جو ولید بن مغیرہ برت رہا ہے تو ان کے منہ ٹھہلس دیئے
 جائیں گے اور ان کی کھال جلا کر کوٹے کی طرح سیاہ کر دی جائے گی۔

۱۹ یہاں سے لے کر تیسرے رب کے لشکروں کو خود اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا سنگ کی پوری عبارت
 ایک جملہ معترضہ ہے جو دورانِ تقریر میں مسئلہ کلام کو توڑ کر اُن معترضین کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا ہے
 جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ سن کر کہ دوزخ کے کارکنوں کی تعداد صرف ۱۹ ہوگی،
 اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ ان کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ایک طرف تو ہم سے یہ کہا جا رہا ہے
 کہ آدم علیہ السلام کے وقت سے لے کر قیامت تک دنیا میں جتنے انسانوں نے بھی کفر اور کبرہ گناہوں کا
 ارتکاب کیا ہے وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے، اور دوسری طرف ہمیں یہ خبر دی جا رہی ہے کہ اتنی بڑی
 دوزخ میں اتنے بے شمار انسانوں کو عذاب دینے کے لیے صرف ۱۹ کارکن مقرر ہونگے۔ اس پر قریش کے
 سرداروں نے بڑے زور کاٹھٹھا مارا۔ ابو جہل بولا: ”بھائیو، کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تم میں سے
 دس دس آدمی مل کر بھی دوزخ کے ایک ایک سپاہی سے نمٹ نہ لیں گے؟“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب
 کہنے لگے: ”اے سے تو میں اکیلا نمٹ لوں گا، باقی دو کو تم سب مل کر سنبھال لینا،“ انہی باتوں کے جواب
 میں یہ فقرے بطور جملہ معترضہ ارشاد ہوئے ہیں۔

۲۰ یعنی اُن کی قوموں کو انسانی قوموں پر قیاس کرنا تمہاری حماقت ہے۔ وہ آدمی نہیں، نرستے ہوئے

اور تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کسی زبردست طاقتوں کے فرشتے پیدا کیے ہیں۔

۱۹ یعنی بظاہر تو اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ دوزخ کے کارکنوں کی تعداد بیان کی جاتی۔ لیکن ہم نے ان کی یہ تعداد اس لیے بیان کر دی ہے کہ یہ ہر اس شخص کے لیے فتنہ بن جائے جو اپنے مانند کوئی کفر چھپائے بیٹھا ہو۔ ایسا آدمی چاہے ایمان کی کتنی ہی نمائش کر رہا ہو، اگر وہ خدا کی خدائی اور اس کی عظیم قدرتوں کے بارے میں، یا وحی و رسالت کے بارے میں شک کا کوئی شائبہ بھی اپنے دل کے کسی گوشے میں لیے بیٹھا ہو تو یہ سمجھتے ہی کہ خدا کی اتنی بڑی جیل میں بے حد و حساب جن اور انسان مجبوراً کہ صرف ۱۹ سپاہی قابو میں بھی رکھیں گے اور فرداً فرداً ایک ایک شخص کو عذاب بھی دیں گے تو اس کا کفر فوراً مکمل کر باہر آجائے گا۔

۲۰ بعض مفسرین نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اہل کتاب دیہود و نصاریٰ کے ہاں چونکہ ان کی اپنی کتابوں میں بھی دوزخ کے فرشتوں کی یہی تعداد بیان کی گئی ہے، اس لیے یہ بات سن کر ان کو یقین آجائے گا کہ یہ بات فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کی فرمائی ہوئی ہے۔ لیکن یہ تفسیر ہمارے نزدیک دو وجہ سے صحیح نہیں ہے۔ اول یہ کہ یہود و نصاریٰ کی جو مذہبی کتابیں دنیا میں پائی جاتی ہیں ان میں تلاش کے باوجود ہمیں یہ بات کہیں نہیں ملی کہ دوزخ کے فرشتوں کی تعداد ۱۹ ہے۔ دوسرے، قرآن مجید میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جو اہل کتاب کے ہاں ان کی مذہبی کتابوں میں بھی بیان کی گئی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اس کی یہ توجیہ کر دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں ان کی کتابوں سے نقل کر لی ہیں۔ ان وجہ سے ہمارے نزدیک اس ارشاد کا صحیح مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میری زبان سے دوزخ کے ۱۹ فرشتوں کا ذکر سن کر میرا خوب مذاق اڑایا جائے گا، لیکن اس کے باوجود بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی میں بیان ہوئی تھی اسے انہوں نے کسی خوت اور جھجک کے بغیر علی الاعلان لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اور کسی کے مذاق و استہزاء کی ذرہ برابر پروا نہ کی۔ جہلائے عرب تو انبیاء کی شان سے ناواقف تھے، مگر اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ انبیاء کا ہر نکتہ میں یہی طریقہ رہا ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے آتا تھا اسے وہ جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیتے تھے خواہ

اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے، اور اہل کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں اور دل کے بیمار وہ لوگوں کو پسند ہو یا ناپسند۔ اس بنا پر اہل کتاب سے یہ بات زیادہ متوقع تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کو دیکھ کر انہیں یقین آجائے گا کہ ایسے سخت مخالف ماحول میں ایسی بظاہر انتہائی عجیب بات کو کسی جھجک کے بغیر پیش کر دینا ایک نبی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ طرز عمل بار بار ظاہر ہوا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال معراج کا واقعہ ہے جسے آپ نے کفار کے مجمع عام میں بلا تکلف بیان کر دیا اور اس بات کی ذرہ برابر پروا نہ کی کہ اس حیرت انگیز قصے کو سن کر آپ کے مخالفین کیسی کیسی باتیں بنا سکیں گے۔ لہذا یہ بات اس سے پہلے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہو چکی ہے کہ ہر آزمائش کے موقع پر جب ایک مومن اپنے ایمان پر ثابت قدم رہتا ہے اور شکر و انکار یا اطاعت سے فرار یا دین سے بے وفائی کی راہ چھوڑ کر یقین و اعتماد اور اطاعت و فرمانبرداری اور دین سے وفاداری کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس کے ایمان کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، آل عمران، آیت ۱۷۳۔ جلد دوم، الانفال، آیت ۲، حاشیہ ۲۔ التوبہ، آیات ۱۲۴-۱۲۵۔ حاشیہ ۱۲۵۔ جلد چہارم، الاحزاب، آیت ۲۲، حاشیہ ۳۸۔ جلد پنجم، الفتح، آیت ۴، حاشیہ ۷)۔

۳۔ قرآن مجید میں چونکہ بالعموم ”دل کی بیماری“ سے مراد منافقت لی جاتی ہے، اس لیے یہاں اس لفظ کو دیکھ کر بعض مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے کیونکہ منافقت کا ظہور مدینہ ہی میں ہوا ہے۔ لیکن یہ خیال کئی وجہ سے صحیح نہیں ہے۔ اول تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ مکہ میں منافق موجود نہ تھے، اور اس کی غلطی ہم تفہیم القرآن جلد سوم میں صفحہ ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴ اور ۶۸۰ تا ۶۸۴ پر واضح کر چکے ہیں۔ دوسرے یہ طرز تفسیر ہمارے نزدیک درست نہیں ہے کہ ایک سلسلہ کلام جو ایک خاص موقع پر خاص حالات میں ارشاد ہوا ہو، اس کے اندر یکایک کسی ایک فقرے کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے موقع پر نازل ہوا تھا اور یہاں لا کر کسی مناسبت کے بغیر شامل کر دیا گیا۔ سورہ مدثر کے اس حصے کا تاریخی پس منظر ہمیں معتبر روایات سے معلوم ہے۔ یہ ابتدائی کئی دور کے

اور کفار یہ کہیں کہ بھلا اللہ کا اس عجیب بات سے کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اس طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخش دیتا ہے۔ اور تیرے رب کے شکر و کونود

ایک خاص واقعہ کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ اُس کا پورا سلسلہ کلام اس واقعے کے ساتھ صریح مناسبت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں آخر کونسا موقع تھا کہ اس ایک فقرے کو، اگر وہ کئی سال بعد مدینہ میں نازل ہوا، اس جگہ لاکر چسپاں کر دیا جاتا، اب رہا یہ سوال کہ یہاں دل کی بیماری سے مراد کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد شک کی بیماری ہے کہ میں ہی نہیں، دنیا جبر میں پیدہ بھی اور آج بھی کم لوگ ایسے تھے اور میں جو تقیّت کے ساتھ خدا، آخرت، وحی، رسالت، جنت، دوزخ وغیرہ کا انکار کرتے ہوں۔ اکثریت ہرزمنے میں انہی لوگوں کی رہی ہے جو اس شک میں مبتلا رہے ہیں کہ معلوم نہیں خدا ہے یا نہیں، آخرت ہوگی یا نہیں، فرشتوں اور جنت اور دوزخ کا واقعی کوئی وجود ہے یا یہ محض افسانے ہیں، اور رسول واقعی رسول تھے اور ان پر وحی آتی تھی یا نہیں۔ یہی شک اکثر لوگوں کو کفر کے مقام پر کھینچ لے گیا ہے، ورنہ ایسے بے وقوف دنیا میں کبھی زیادہ نہیں رہے جنہوں نے بالکل قطعی طور پر ان حقائق کا انکار کر دیا ہو، کیونکہ جس آدمی میں ذرہ برابر بھی عقل کا مادہ موجود ہے وہ یہ جانتا ہے کہ ان امور کے صحیح ہونے کا امکان بالکل رد کر دینے اور انہیں قطعاً خارج از امکان قرار دینے کے لیے ہرگز کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔

۳۱۱ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اسے اللہ کا کلام تو مان رہے تھے مگر تعجب اس بات پر ظاہر کر رہے تھے کہ اللہ نے یہ بات کیوں فرمائی۔ بلکہ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جس کلام میں ایسی بعید از عقل و فہم بات کہی گئی ہے وہ بھلا اللہ کا کلام کیسے ہو سکتا ہے۔

۳۱۲ یعنی اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے کلام اور اپنے احکام و فرامین میں وقتاً فوقتاً ایسی باتیں ارشاد فرماتا ہے جو لوگوں کے لیے امتحان اور آزمائش کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ایک ہی بات ہوتی ہے جسے ایک راستی پسند، سلیم الطبع اور صحیح الھکام آدمی سنتا ہے اور سیدھے طریقے سے اس کا سیدھا مطلب سمجھ کر سیدھی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ اُس بات کو ایک ہٹ دھرم، کج فہم اور راستی سے گریز کرنے والا آدمی سنتا ہے اور اُس کا ٹیڑھا مطلب نکال کر اسے حق سے دُور بھاگ جانے کے لیے ایک نیا بہانا بنا لیتا ہے۔ پہلا آدمی

۲۵ اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا — اور اس وصف کا ذکر اس کے سوا کسی غرض کے لیے نہیں کیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس سے نصیحت ہو۔ ہرگز نہیں، قسم ہے چاند کی، اور رات کی جبکہ وہ طہی ہے، اور صبح کی جبکہ وہ روشن ہوتی ہے، یہ وصف بھی بڑی چیزوں میں سے ایک ہے۔ انسانوں

چونکہ خود حق پسند ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اسے ہدایت بخش دیتا ہے، کیونکہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ ہدایت چاہنے والے کو زبردستی گمراہ کرے۔ اور دوسرا آدمی چونکہ خود ہدایت نہیں چاہتا بلکہ گمراہی کو ہی اپنے لیے پسند کرتا ہے اس لیے اللہ سے ضلالت ہی کے راستوں پر دھکیل دیتا ہے، کیونکہ اللہ کا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ جو حق سے نفرت رکھتا ہو وہ اسے جبراً کھینچ کر حق کی راہ پر لائے۔ (اللہ کے ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کے مسئلے پر تفہیم القرآن میں بکثرت مقامات پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۱۰، ۱۶، ۱۹، ۲۰، انفار، حاشیہ ۱۳، الانعام، حاشیہ ۱۷، ۲۸، ۹۰، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۳، جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۵، القصص، حاشیہ ۷)۔

۲۵ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کائنات میں کسی کسی اور کئی مخلوقات پیدا کر رکھی ہیں، اور ان کو کیا کیا طاقتیں اس نے بخشی ہیں، اور ان سے کیا کیا کام وہ لے رہا ہے، ان باتوں کو اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ ایک چھوٹے سے کرہ زمین پر رہنے والا انسان اپنی محدود نظر سے اپنے گرد و پیش کی چھوٹی سی دنیا کو دیکھ کر گمراہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خدا کی خدائی میں بس وہی کچھ ہے جو اسے اپنے حواس یا اپنے آلات کی مدد سے محسوس ہوتا ہے، تو یہ اس کی اپنی ہی نادانی ہے۔ ورنہ یہ خدائی کا کارخانہ اتنا وسیع و عظیم ہے کہ اس کی کسی ایک چیز کا بھی پورا علم حاصل کر لینا انسان کے بس میں نہیں ہے، لہذا اس کی ساری وسعتوں کا تصور اس کے چھوٹے سے دماغ میں سما سکے۔

۲۶ یعنی لوگ اپنے آپ کو اس کا مستحق بنانے اور اس کے عذاب کا مزا چھیننے سے پہلے ہوش میں آجائیں اور اپنے آپ کو اس سے بچانے کی فکر کریں۔

۲۷ یعنی یہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے جس کا اس طرح مذاق اڑایا جائے۔

۲۸ یعنی جس طرح چاند، اور رات اور دن اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عظیم نشانات ہیں اسی طرح

کے لیے ڈراوا، تم میں سے ہر اس شخص کے لیے ڈراوا جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے۔

دوزخ بھی عظیم قدرت میں سے ایک چیز ہے۔ اگر چاند کا وجود غیر ممکن نہ تھا، اگر رات اور دن کا اس باقاعدگی کے ساتھ آنا غیر ممکن نہ تھا، تو دوزخ کا وجود، آخر کیوں تمہارے خیال میں غیر ممکن ہو گیا؟ ان چیزوں کو چونکہ تم رات دن دیکھ رہے ہو اس لیے تمہیں ان پر کوئی حیرت نہیں ہوتی، ورنہ اپنی ذات میں یہ بھی اللہ کی قدرت کے نہایت حیرت انگیز معجزے ہیں، جو اگر تمہارے مشاہدے میں نہ آتے ہوتے، اور کوئی تمہیں خبر دیتا کہ چاند جیسی ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے، یا سورج ایک چیز ہے جس کے چھینے سے دنیا میں اندھیرا ہو جاتا ہے، اور جس کے نکل آنے سے دنیا چمک اٹھتی ہے، تو تم جیسے لوگ اس بات کو سن کر بھی اسی طرح ٹھٹھے مارتے جس طرح دوزخ کا ذکر سن کر ٹھٹھے مارتے ہو۔

۲۹۔ مطلب یہ ہے کہ اس چیز سے لوگوں کو ڈرا دیا گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس سے ڈر کر بھلائی کے راستے پر آگے بڑھے اور جس کا جی چاہے پیچھے ہٹ جائے۔